خطبۂ اقبال "مسلم ثقافت کی روح" کا نیا تناظر: محمد سہیل عمر کی تعبیر کا تجزیاتی مطالعہ

New Perspective of Iqbal's Lecture "The Spirit of Muslim Culture": Analytical Study of Muhammad Sohail Umar's Interpretation

ڈاکٹر محمد خرم یاسین
لیکچرار، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

Abstract:
This study explores the philosophical and cultural insights presented by Allama Muhammad Iqbal in his fifth lecture titled *"The Spirit of Muslim Culture"* delivered during a time of Muslim decline in British India. Iqbal's lectures aimed at reviving the intellectual and spiritual heritage of Muslims. The paper reviews key themes, such as the relationship between prophecy and sainthood, the nature of revelation, and the role of Muslim culture in the advancement of human consciousness. It also examines the significance of intellectual dynamism within Islam, contrasting it with static philosophical traditions, and emphasizes Iqbal's call for a rejuvenation of Islamic thought through *ijtihad* (independent reasoning). By critiquing the cultural stagnation and promoting a forward-thinking Islamic philosophy, Iqbal envisioned a revitalized Muslim identity capable of contributing to global progress. The commentary delves into various interpretations by scholars such as Sohail Umar, highlighting both alignment and criticism of Iqbal's ideas, particularly on prophecy, sainthood, and intellectual inquiry in Islamic traditions.

Keywords:
مسلم کلچر(Muslim Culture)، نبوت اور سنت (Prophecy and Sainthood)، روحانی تجربہ (Spiritual Experience)، تعمیرِ نو(Reconstruction)، مذہبی(Religious)۔

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے جس دور میں آنکھ کھولی وہ افریقہ وایشیا اور ایشیا میں بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کے ملی زوال کا دور تھا۔ انگریزی استعماریت اور صنعتی انقلاب کے ملے جلے اثرات نے ان کی وہ مذہبی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں جو کسی دور میں ان کی مادی وروحانی ترقی کا طرۂ امتیاز رہی تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی، انگریز کے خلاف ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید کی مسلح کارروائیوں کی ناکامی کے سبب ان کی بچی کھچی ہمت بھی جاتی رہی۔ یوں انگریز کی غلامی نے مسلمانوں کو جہاں ان کے تابناک ماضی کی وجوہات پر غور کرنے کی دعوت دی وہیں جدید

تہذیب، ترقی یافتہ سامانِ حرب، تیز تر ذرائع نقل و حمل اور ذرائع ابلاغ نے بھی انھیں متاثر کیا۔ اس صورتِ حال میں ان کے لیے جو امر سب سے زیادہ پریشانی کا باعث بنا وہ ان کا فکری جمود و انتشار اور عمل سے دوری تھا جس کے سبب ان میں نظریاتی تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ ایسے میں سر سید احمد خان کے بعد علامہ محمد اقبال نے بطور مصلح قوم مسلمانوں کے اس ڈوبتے بیڑے کو بچانے کی کوشش کی۔

علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے لیے نظم و نثر میں جو فکری مواد مہیا کیا، "خطباتِ اقبال" ان میں اہم ترین درجہ رکھتے ہیں۔ ان خطبات کی تعداد ابتداً چھے تھی اور انھیں مسلمانوں کے مختلف مقامات پر اجتماعات میں، جن میں مدراس، بنگلور، میسور، حیدر آباد دکن اور علی گڑھ شامل تھے، پیش کیا گیا تھا۔ بعد میں ارسٹوٹیلین سوسائٹی لندن میں ساتواں خطبہ پڑھنے کے بعد انھیں یکجا کر کے The Reconstruction of Religious Thought in Islam کے عنوان کے تحت 1930ء میں شایع کروا دیا گیا۔ ان خطبات کے عناوین یہ تھے:

1.Knowledge and Religious Experience (علم اور مذہبی مشاہدہ / تجربہ)

2.The Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience (مذہبی واردات کے انکشاف کی فلسفیانہ پرکھ)

3.The Conception of God and Meaning of Prayer
(خدا کا تصور اور عبادت / دعا کا مفہوم)

4.The Human Ego - His Freedom and Immortality
(انسانی خودی، اس کی آزادی اور لافانیت / بقا)

5.The Spirit of Muslim Culture (مسلم ثقافت کی روح)

6.The Principle of Movement in the Structure of Islam
(نظامِ اسلام میں حرکت کا اصول / تصور)

7.Is Religion Possible? (کیا مذہب کا امکان ہے؟)

موضوع کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہر خطبہ دوسرے خطبے سے منسلک ہے اور ان خطبوں میں ایک ربط موجود ہے۔ پہلے خطبے میں علامہ اقبال یہ واضح کرتے ہیں کہ علم کے دیگر رسمی ذرایع کے ساتھ ساتھ ایک غیر رسمی ذریعہ روحانیات بھی ہے۔ انبیاے کرام کے ذریعے اللہ کریم اپنا بہترین پیغام انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا اس لیے اس پیغام پر عمل کرنے سے انسان روحانی درجات میں بلند ہوتا ہے اور اس پر حیات و کائنات کے بہت سے اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔ اس خطبے کا اختتام وہ روحانی تجربات کے مشمولات کے بیان کے ساتھ کرتے ہیں۔ دوسرے خطبے میں علامہ اقبال مذہبی تجربے کو عقلی میزان پر پرکھنے کی بات کرتے ہیں تاکہ دیکھا جائے کہ جدید علوم اس

کو پرکھنے کے قابل بھی ہیں یا نہیں۔ تیسرے خطبے میں وہ انسان کا خالق سے تعلق بیان کرتے ہوئے ذاتِ باری کو سمجھنے اور اس سے مضبوطی سے جڑنے کی بات کرتے ہیں۔ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کے تصور کے کچھ نئے زاویے بھی پیش کرتے ہیں اور انفرادی و اجتماعی دعا و نماز کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ بندے کا رب سے تعلق مضبوط ہو۔ مقصود یہ ہے کہ ایمان کی بنیاد تشکیک کے بجائے یقین پر رکھی جائے۔ چوتھے خطبے میں وہ انسانی خودی کی ماہیت اور افعال پر بات کرتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں بھی ایک برتر روحانی تجربے کا حصول اور خود کو اس قابل بنانا شامل ہے کہ رب کے حضور عزت و تکریم سے پیش ہوا جائے اور دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کیا جائے۔ پانچویں خطبے میں علامہ اقبال اسلام کی اس ثقافت کا ذکر کرتے ہیں جو حصولِ علم سے جڑی ہے اور انسان کو انسانیت کا برتر شعور عطا کرتی ہے۔ چھٹے خطبے میں وہ عصرِ حاضر کے مسائل کے حل کے لیے اجتہاد کے در کو از سرِ نو وا کرنے کی بات کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے آسانی پیدا ہو اور مسلمات سے قطع نظر دین کی ایسی شکل پیش کی جاسکے جو ان کی زندگیوں کو عملی طور پر بہتر بناتے ہوئے ان کے مسائل کا حل پیش کر سکے۔ ساتویں خطبے میں علامہ اقبال کا مقصود یہ ہے کہ دین کی حقانیت کو عالمی فلاسفہ کے سامنے پیش کیا جائے اور انھیں یہ باور کرایا جائے کہ یہ دین عہدِ پارینہ کا حصہ نہیں، بلکہ زندہ و جاوید اور انسانیت کی فلاح اور علم کے حصول کا اہم ذریعہ ہے۔ اسی سے دنیا بھر کے علما بشمول یورپ و امریکہ کے اہلِ دانش نے روشنی حاصل کی ہے اور اسی سے مسلمانوں کے ایوانوں کے چراغ روشن رہے ہیں۔

ان خطبات کے کثیر اور دقیق مضامین کو سامنے رکھتے ہوئے سعید احمد اکبر آبادی، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر وحید عشرت، سید وحید الدین، ڈاکٹر محمد آصف اعوان، ڈاکٹر ایوب صابر، پروفیسر محمد عثمان، محمد شریف بقا، عبدالحفیظ کاردار، محمد شعیب آفریدی، ڈاکٹر محمد معروف اور محمد سہیل عمر وغیرہ نے قارئین کی آسانی کے لیے تفہیمی کاوشیں کی ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ذیل میں اس حوالے سے سہیل عمر کی خطبہ پنجم کی تفہیمی کاوش کو زیرِ غور لایا جارہا ہے۔

اس خطبے میں مسلم ثقافت کے خدوخال، اجزا اور منابع و مصادر کا ذکر ہے۔ چوں کہ یہ ثقافت حضرت محمد ﷺ کی آمد اور دنیا کے لیے پیغاماتِ الٰہی بذریعہ وحی سے جڑی ہے اس لیے خطبے کی پہلی بحث شعور نبوت، ختمِ نبوت، نبوت اور ولایت میں فرق اور انبیا کی ذمہ داریوں پر مشتمل ہے۔ شعورِ نبوت و ولایت کے فرق کی وضاحت میں علامہ اقبال نے صوفی شاعر عبدالقدوس گنگوہی کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت محمد مصطفی ﷺ رفعت کی بلند ترین سطح (بلند ترین آسمان اور قربِ الٰہی) پر تشریف لے جاکر لوٹ آئے، اگر مجھے یہ سعادت ملتی تو میں کبھی نہ واپس آتا۔ اقبال (1) کے الفاظ میں:

MUHAMMAD (PBUH) of Arabia ascended the highest Heaven and returned. I swear by God that if I had reached that point, I should never have returned.

علامہ محمد اقبال کے مطابق یہ بیان ایک ولی اور نبی کریم ﷺ کے نفسیاتی شعور کے فرق کو سمجھنے کے لیے اہم ہے۔ یہاں مراد محض حضور ﷺ کی ذات بابرکات ہی نہیں بلکہ تمام انبیا ہیں۔ مذہبی تجربے / وجدانی یا روحانی حالت میں ایک صوفی تجلیاتِ الٰہی میں گم ہو جاتا ہے یا انفرادی سکون واطمینانِ قلب کی خاطر ایسا کرتا ہے۔ اس کی یہ وجدانی حالت، انبیا کے روحانی تجربے کی نسبت نہایت ادنیٰ درجے کی ہوتی ہے جہاں وہ کوئی پیغام الٰہی کسی بھی صورت میں وصول نہیں کرتا، نہ ہی کر سکتا ہے۔ اس کی کوئی بھی روحانی حالت وحی کے قریب نہیں پھٹکتی۔ اس کی یہ حالت انفرادی نوعیت کی ہوتی ہے جس کا اجتماعیت یا قوم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس حال میں گم رہنا چاہتا ہے جب کہ انبیا علیہم السلام، جو کہ اللہ کریم کے چنیدہ ہوتے ہیں، وجدان یا حالتِ وحی سے واپسی پر اجتماعی فوائد اور فلاحِ انسانیت کا مقصد لے کر چلتے ہیں اور قوموں کی زندگی میں ایسا انقلاب برپا کرتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں سال تک لوگ ان سے فیض یاب ہوتے رہیں اور اپنا دین اور دنیا سنوارتے رہیں۔ اقبال(2) اس حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

He returns to insert himself into the sweep of time with a view to control the forces of history, and thereby to create a fresh world of ideals. For the mystic the repose of "unitary experience" is something final; for the prophet it is the awakening, within him, of world-shaking psychological forces, calculated to completely transform the human world.

عشرت(3) فکرِ اقبال کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

> "صوفی کے لیے اتحاد کی لذت اس کی آخری منزل ہے مگر نبی کے لیے یہ تجربہ اپنے آپ میں دنیا کو ہلا دینے والی نفسیاتی قوتوں کو بیدار کرنے کا عمل ہے جس سے عالم انسانیت کو مکمل طور پر تبدیل کیا جا سکے۔ یہ خواہش کہ اس کا مذہبی تجربہ ایک زندہ عالمگیر قوت میں تبدیل ہو جائے، نبی میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی واپسی اس کے روحانی تجربے کی قدر و قیمت کے لیے ایک طرح کا نتائجی معیار بن جاتی ہے۔ اپنے تخلیقی عمل میں نبی کی قوت ارادی اپنا اور محسوس حقائق کی دنیا کا بھی جائزہ لیتی ہے جس میں وہ اپنے آپ کا معروضی طور پر اظہار کرتی ہے۔ اپنے سامنے موجود غیر اثر پذیر مادے میں نفوذ سے پہلے وہ خود کو خود اپنے لیے دریافت کرتا ہے اور پھر تاریخ کی آنکھ کے سامنے خود کو ظاہر کرتا ہے۔"

ایک نبی کے مذہبی تجربے کے نتائج کو پرکھنے کا معیار وہ یہ مقرر کرتے ہیں کہ دیکھا جائے کہ اس کی شریعت یا تہذیب و تمدن کے زیرِ اثر کس قسم کے انسان اور انسانیت پروان چڑھی۔ اس حوالے سے وہ(4) ولیم جیمز کا ایک بیان قبل ازیں خطبات میں بیان کر چکے ہیں کہ اکثر اوقات جڑ کو دیکھ کر درخت کی شناخت نہیں کی جا سکتی البتہ پھل دیکھ کر ضرور اس کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے:

"In the end it had come to our empiricist criterion: By their fruits they shall know them, not by their roots."

یہاں یہ بات علامہ صاحب اس لیے بیان کر رہے ہیں کیوں کہ ساتویں خطبے میں انھوں نے انگریزوں کو حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات پر اعتراضات کے جواب میں یہ جتایا ہے کہ ان کے غلاموں کے غلاموں سے پڑھ کر یورپ میں جدید سائنس کی بنیادیں رکھی گئیں۔ ایسے میں ان کے آقا ﷺ پر کس طرح نفسیاتی حوالے سے کسی قسم کا کوئی الزام لگایا جاسکتا ہے یا کجی بیان کی جاسکتی ہے؟

علامہ صاحب کی اس ساری بحث کے نتیجے میں کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ نبی اور ولی ایک جیسے تجربے سے گزرتے ہیں یا آج بھی کوئی اگر بڑے روحانی تجربے سے گزرے تو نبوت کا دعویٰ کر سکتا ہے، علامہ اقبال نے اگلی بحث ختمِ نبوت پر قائم کی ہے۔ نبوت کے حوالے سے چوں کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ وہ اسے اعلیٰ ترین درجے کا روحانی شعور سمجھتے ہیں جس میں اتصال کا تجربہ (Unitary Experience) نہ صرف اپنی حدود و قیود سے تجاوز (overflow) کا رجحان رکھتا ہے بلکہ اجتماعی زندگی کی قوتوں کو سیر اب کرنے، جلا بخشنے اور تازگی دینے کا بھی خواہاں رہتا ہے۔ یوں ایک نبی انسانیت کو فرسودہ تہذیبوں اور زنگ آلود ماضی سے نجات دلا کر زندگی کی نئی جہات، نئے پرتو، نئی توانائیاں اور حقائق منکشف کرتا چلا جاتا ہے۔ چوں کہ حضور ﷺ کو اس وقت مبعوث کیا گیا جس وقت نہ صرف نئے نصابِ انسانیت کی ضرورت تھی بلکہ ایسے اصول و ضوابط وضع اور اطلاق کرنے تھے جو رہتی دنیا تک انسانیت کی فلاح و بہبود کا باعث ہوں، اس لیے آپ ﷺ پر قرآنِ مجید کے نزول اور ظاہری حیات کے اختتام پر نبوت کا در ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اب دنیا میں جتنی بھی قومیں آئیں، وقت تبدیل ہو، جنگ ہو، امن ہو یا کوئی بھی صورتِ حال ہو، شریعتِ محمدی ﷺ کی صورت میں ایک ایسا دین موجود ہے جس کے اصول بین الاقوامی اخلاقیات، امن اور سلامتی کے ضامن ہیں۔ جو اسے دل سے قبول کرے گا وہ دین و دنیا میں فلاح پائے گا۔

اس ضمن میں ایک اور بحث علامہ اقبال وحی کی ماہیت پر قائم کرتے ہیں۔ چوں کہ قرآنِ مجید میں مختلف تخلیقاتِ ربانی جیسے زمین و آسمان، پہاڑ، شہد کی مکھی وغیرہ کا ذکر ہے اور کچھ ایسے انسان بھی جو نبی نہیں تھے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ، ان کی جانب کیے گئے اشاروں، دیے گئے حکم اور ان کے دل میں نیکی کی بات ڈالنے کا ذکر کیا ہے اس لیے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ان اشارات کو ہر گز انبیا کی جانب آنے والی وحی نہ سمجھا جائے کیوں کہ انبیا کی جانب آنے والی وحی یونیورسل خوبیوں سے مزین ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم مختلف طریقوں سے کائنات کے ذرّے ذرّے تک پہنچتا ہے۔ ہر پیغام کو وحی نہیں کہا جاسکتا۔ چوں کہ وحی اشارے کے معنی میں بھی مستعمل ہے تو غیر نبی کے لیے وہ محض اشارہ یا دل میں کوئی غیبی خیال کا آجانا ہی ہو گا۔ اس ضمن میں وہ (5) لکھتے ہیں:

The plant growing freely in space, the animal developing a new organ to suit a new environment, and a human being receiving light from the inner depths of life, are all cases of inspiration varying in character according to the needs of the recipient, or the needs of the species to which the recipient belongs.

علامہ نے وحی کی خوبیوں کو "Universal Properties" کہا ہے۔ اسے اس ضمن میں دو طریقوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ انبیا کرام کی ہدایت کسی ایک قوم کے لیے نہیں بلکہ جب تک اگلا نبی مبعوث نہ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں جب کہ نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے، تو یہ پیغام رہتی دنیا تک، ہر قوم اور قبیلے کے لیے ہے۔ اس لیے ایسے کلام کی موجودگی میں جس میں زندہ و مردہ انسانوں کے ساتھ ساتھ چرند پرند تک کے حقوق و فرائض کا ذکر موجود ہے، اور ایسے قواعد انسانیت کو دے دیے گئے ہیں جو اسے راہِ ہدایت بخشتے ہیں، پر امن معاشرہ قائم کرتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، اسے یونیورسل بناتا ہے۔ دوم یہ کہ چونکہ القا والہام کے لیے انگلش میں الگ سے لفظ موجود نہیں ہے، اور خود قرآنِ مجید میں اس لفظ کے لیے وحی ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے جو اشارہ کے معنی میں زیادہ مستعمل ہے تو علامہ اقبال نے وحی کی یونیورسل پراپرٹی بیان کرتے ہوئے، انسانوں کے علاوہ اپنی جن دیگر تمام تخلیقات کو حکم دیا ہے اسے وحی کہا ہے۔ مثلاً شہد کی مکھی کو دیا گیا حکم جسے وحی یا اشارہ کہا جاسکتا ہے (سورۃ النحل–آیت 68،69)۔ آسمان کو حکم جو وحی یا اشارہ کے معانی میں مستعمل ہے۔ (سورۃ حٰم السجدہ–آیت 12) فرشتوں سے کلام یا حکم جس میں مومنین کو مضبوط کرنے کے لیے بھیجے جانے کا اشارہ ہے۔ (سورۃ الانفال–آیت 12)، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ کے دل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق دریا کے سپرد کر دینے کا اشارہ (سورۃ القصص–آیت 7)، آسمان اور زمین سے حکم و اشارہ (سورۃ حٰم السجدہ– آیت 11)، آگ کو حکم و اشارہ (سورۃ الانبیاء–آیت 69)، پہاڑوں سے خطاب (سورۃ الحشر–آیت 21) وغیرہ۔ مذکورہ امثال اشارے یا حکم کے معنی کے زیادہ قریب ہیں۔ ختمِ نبوت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے یہ بیان کیا ہے کہ اس کی ضرورت خطہ عرب اور جس وقت میں درپیش تھی، وہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا تھا۔ آپ ﷺ کا عہدِ نبوت جدت و قدامت کے سنگم پر موجود تھا۔ عقلی یا استقرائی طور پر انسان آہستگی سے شعور کی اس بلندی کی جانب بڑھ چکا تھا کہ اللہ کریم کے آخری کلام کو قبول کرے اور اسے دل سے تسلیم کرے۔ اس ضمن میں فکرِ اقبال کا ترجمہ از نیازی (6) ملاحظہ کیجیے:

یہ آپ ﷺ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا، استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چوں کہ اپنی معراج کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔

اس ضمن میں علامہ اقبال کہتے ہیں کہ انسان کا فرض ہے کہ اپنا روحانی سفر جاری رکھے، انفس و آفاق کا مطالعہ کرتا رہے، اس سے اس کا دینی و دنیاوی شعور بلند ہو گا اور مشاہدۂ حق، اسے حق سے قریب کر دے گا، کیوں کہ فطرت دراصل آیاتِ الٰہی یعنی اللہ کی نشانیاں ہیں۔ سلسلۂ نبوت کے اختتام کے بعد علامہ اقبال اس بات کے خواہاں ہیں کہ انسان انفرادی اور اجتماعی سطح پر روحانی ترقی کی منازل طے کرے کیوں کہ اسے اس سلسلے میں اسے آزادی بھی دی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے باطنی تجربے کے ساتھ ساتھ تاریخ اور فطرت کے مطالعہ کو بھی ذریعہ علم قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے قرآنِ مجید کی آیات بھی پیش کی ہیں اور یہ آیات یونانی فکر کے رد میں بھی لائے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی فلسفہ انفس و آفاق کے مشاہدے کو درخور اعتنا سمجھتا تھا۔ یونانی فکر سے مسلمان علما کا اثر قبول کرتے ہوئے انفس و آفاق کے مطالعے سے دور ہونے کا ذکر علامہ اقبال نے دیگر خطبات میں بھی کیا ہے۔ وہ دکھ کے ساتھ یونانی فلسفے کی روایتی تصوریت کو اسلامی تہذیب کی تجربی اور عملی روح سے متصادم قرار دیتے ہیں۔ قرآن انسان کو عملی زندگی کی دعوت دیتا ہے، جس میں تاریخ اور فطرت کے مطالعے سے انسان کو خدا کی نشانیوں کو پہچاننے کا حکم دیا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن کائنات کو ایک مسلسل ارتقائی عمل کے طور پر دیکھتا ہے، جو یونانی فلسفے کے جامد تصور کے برعکس ہے۔ قرآن مجید کائنات کو ایک متحرک، متناہی اور فروغ پانے والی حقیقت کے طور پر بیان کرتا ہے، جب کہ یونانی فلسفے میں وقت یا تو غیر حقیقی ہے یا ایک دائروی حرکت میں چلتا ہے۔ اسلام میں کائنات ایک تخلیقی اور جاری عمل ہے جس کی بنیاد قرآن کی آیات میں موجود ہے۔ اس بحث میں علامہ اقبال زمان و مکان کے نظریات کو بھی پیش کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ خطبہ اسلام کی اس ثقافت کی جانب توجہ دلاتا ہے جو علم کی گہرائی میں جھانکنے، تجربہ کرنے، انفس و آفاق کا مطالعہ کرنے ،کائنات کو ایک تخلیقی، ترقی پذیر اور مسلسل بدلتی ہوئی حقیقت کے طور پر تسلیم کرنے پر مشتمل ہے۔

محمد سہیل عمر نے "خطباتِ اقبال نئے تناظر میں" تحریر کر کے اپنے خیال میں قارئین کو فکرِ اقبال کے نئے زاویے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ ساری کتاب بہت سے مقامات پر فکرِ اقبال پر سوال اٹھاتی ہے اور قاری بہر حال اس ضمن میں کسی بھی واضح منزل پر پہنچ نہیں پاتا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کا مجموعی مزاج استفہامی ہے اور اس میں توضیحی حصہ نسبتاً کمزور ہے۔ خطبۂ پنجم کے حوالے سے محمد سہیل عمر نے جزوی طور پر خطبے کے اقتباسات نقل کر کے ان سے بحث کی ہے۔ خطباتِ اقبال سے متعلق ان کے اکثر سوالات وہی ہیں جو ان سے قبل برہان احمد فاروقی، علی عباس جلال پوری اور الطاف احمد اعظمی ایسے لوگ کر چکے تھے۔ اپنی اس کتاب کو بھی انھوں نے اپنے استادِ محترم برہان احمد فاروقی کے امالی کا نام دیا ہے۔ اس کاوش کو انھوں نے پندرہ صفحات (صفحہ نمبر ۱۱۵ سے صفحہ نمبر ۱۲۹) پر پھیلایا ہے جس میں محض خطبۂ پنجم ہی سے تیرہ طویل اور دو مختصر اقتباسات نقل کیے ہیں۔ ان اقتباسات میں سے دس

کے سامنے انھوں نے ان کا ترجمہ دیا ہے۔ آخر میں تین صفحات پر حواشی و حوالہ جات دیے گئے ہیں جن کی تعداد چھیالیس (۴۶) ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس خطبے پر انھوں نے تفہیمی کاوش سے زیادہ اصل متن کو نقل کر کے اس پر اپنا فکری مواد پیش کیا ہے۔

محمد سہیل عمر نے خطبے کا پہلا اقتباس معروف صوفی بزرگ شیخ عبد القدوس گنگوہی کے بیان کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اگر وہ نبی کریم ﷺ کی جگہ قاب قوسین تک جاتے تو کبھی واپس نہ آتے۔ اس پر انھوں نے فکرِ اقبال پر تبصرہ و تنقید کی ہے کہ گویا علامہ اقبال کے نزدیک ایک نبی اور ولی میں کوئی اساسی فرق نہیں بلکہ یہ فرق محض نفسیاتی ہے ۔ اس حوالے سے عمر (7) لکھتے ہیں:

> ”یہاں اسے جس نکتے کی وضاحت کے لیے پیش کیا گیا ہے وہ غور طلب ہے۔ عبارت کا مضمر مدلول یہ ہے کہ ان دو قسموں کے شعور میں اساسی فرق تو کوئی نہیں ہے بلکہ یہ نوعیت میں ایک البتہ شدت (Intensity) میں متفاوت ہیں۔“

اپنے تئیں محمد سہیل عمر نے علامہ محمد اقبال کی فکری کجی کو واضح کیا ہے۔ حقیقت نظری سے دیکھا جائے تو علامہ محمد اقبال نے یہاں نفسیاتی شعور کی بات ایک ولی اللہ کے حوالے سے کی ہے جس کا مقصود یہ نہیں کہ کوئی بھی ولی نبی بن سکتا ہے بلکہ اس بات کی تردید ہے کہ نفسی کیفیات میں ایک ولی قربِ الٰہی حاصل کر بھی لے تو اس کی وہ کیفیات محدود نوعیت کی ہی ہو سکتی ہیں اور وہ قرب و اتصال کی اس کیفیت کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا جو کہ عطاے خداوندی کے سبب ایک نبی کو میسر ہوتی ہیں۔ محمد سہیل عمر کے اس اعتراض کو ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ ہے اسلام میں نبوت کی وہ قدیم بحث جس میں یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ ایک نبی کے باقاعدہ نبوت کے اعلان کا حکم ملنے سے قبل کے عرصے کو کیا کہا جائے گا؟ کیا وہ اس وقت بھی نبی ہی ہو گا اور کس شریعت پر عمل کرے گا؟ اس لحاظ سے شعورِ نبوت اور شعورِ ولایت کا نقطۂ آغاز اگر اللہ تعالیٰ سے اتصال کی کیفیت کو بیان کیا جائے تو علامہ محمد اقبال کے خیالات کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے۔ اسی ضمن میں اس بحث کو بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ نبوت ہو یا ولایت عطا کرنے والا کون ہے اور اس عطا کے اغراض و مقاصد کیا ہیں۔ نبوت کے حوالے سے علامہ محمد اقبال نے اس کی ذمہ داریوں کی جو بحث کی ہے اس کا بیان نہ کرنا اور محض ایک پیراگراف پیش کر کے ایک نتیجہ اخذ کرنا یقینا تفہیمی حوالے سے قارئین کو مزید الجھانے کا سبب ہے۔ تاہم اس حوالے سے انھوں (8) نے اساسی فرق کی وضاحت یوں کی ہے:

> "دین کا نقطہ کمال نبوت ہے اور تصوّف کا نقطۂ عروج ولایت ہے۔ نبوت وہ وہبی شرف و کمال ہے جو اللہ کی عطا سے انسان کو حاصل ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانوں کو ہدایت کے لیے پیام ربانی ملتا ہے ۔ دوسری طرف ولایت وہ درجہ روحانی ہے جس میں متصوف تقرب الی اللہ کا تحقق حاصل کرتا ہے۔ یہ

اکتسابی ہے اور مجاہدہ اور تقویٰ سے اللہ کی عنایت کے سہارے حاصل ہوتا ہے۔ان میں اساسی فرق ہے ۔ولایت کے حقائق ومعارف کو درجۂ یقین لازماً حاصل نہیں ہوتا۔ان میں غلطی کا امکان ہے جب کہ وحی کے لائے ہوئے حقائقِ نبوت ہر شک سے بالاتر ہیں۔یہ حق الیقین کے مرتبے کی چیز ہیں۔"

فرزندِ اقبال، جاوید اقبال کا موقف یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اپنے پہلے ہی خطبے میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے تین ذرایع بیان کیے تھے جن میں نبی کے لیے وحی کا ذریعہ، ولی کے لیے کشف کا ذریعہ اور ارفع شاعری میں کسی حد تک القا شامل ہیں۔البتہ وہ(9) ان میں فرق کو واضح کرتے ہیں کہ دونوں کے درجات اور نتائج ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔لکھتے ہیں:

"شعور نبوت اور شعور ولایت میں جو فرق ادراک موجود ہے، اقبال نے اسے نہ صرف ملحوظ رکھا ہے بلکہ واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ولی کی واپسی نوع انسانی کے لیے کسی عمومی فائدے کا باعث نہیں بنتی، مگر نبی کی واپسی انسانوں کے لیے اجتماعی طور پر ایک تمدنی انقلاب برپا کر کے نئی دنیا وجود میں لاتی ہے۔پس نبوت اور ولایت میں اسی امتیاز کے بارے میں جو تفصیل ان معترضین نے پیش کی ہے، اس سے اقبال کہیں بھی اختلاف کرتے نظر نہیں آتے۔احمد جاوید کی رائے میں فکر اقبال کا کوئی سنجیدہ قاری یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ اقبال وحی کو ایک باطنی چیز سمجھتے تھے۔"

اس کے بعد محمد سہیل عمر اس بات پر معترض ہیں کہ نبوت کے اثرات کو اختباریت کی کسوٹی پر پرکھنا درست نہیں۔ یہاں یہ وضاحت نہایت ضروری تھی کہ اس ضمن میں علامہ محمد اقبال نے نبوت کے لوگوں کی اجتماعی زندگی پر اثرات اور اس کے نتیجے میں ایسے اعلیٰ وارفع حق گو انسانوں کے سامنے آنے کی بات کی ہے جو ہر حوالے سے بہترین انسانوں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ایسے میں جب کہ یہ خطبات لکھے ہی ایسے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے جارہے ہوں جو ہر بات (فکر و عمل) کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہتے ہوں ان کے لیے علامہ محمد اقبال کا یہ استدلال کس طرح غلط ہو سکتا ہے؟اس ضمن میں اعوان(10) تحریر کرتے ہیں:

"بار بار عقل و خرد کی طرف متوجہ کرنا اور انسان کو فطرت اور تاریخ سے علم و بصیرت کے لیے استفادے کی تاکید کرنا بھی تصور ختم نبوت ہی کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہے اور اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ اب کسی ماورائی شعوری سہارے کا منتظر رہنے کے بجائے انسان آئندہ ارتقا کی منازل اپنی عقلی وشعوری صلاحیتوں کو کام میں لا کر طے کرے گا۔"

محمد سہیل عمر کا اگلا اعتراض یہ ہے کہ نبی کی جو تعریف علامہ محمد اقبال نے کی ہے اس سے یوں لگتا ہے کہ وہ محض مصلح ہیں اور ان کا ذاتِ باری تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔اس ضمن میں اُن(11) کی تحریر ملاحظہ کیجیے:

"اس عبارت میں نبی اور نبوت کے تصور کی تفہیم کے لیے اس کو نابغہ کی تشبیہ سے سمجھانے کی سعی کی گئی ہے ۔اس لیے یہ مشکل پیدا ہوتی ہے کہ بظاہر یہ تصور خدا سے منقطع لگتا ہے اور سماجی مصلح یا تخلیقی فنکار سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتا ہے اور اسے خدا کے حوالے کے بغیر بھی کائنات کے لیے استعمال کرنا ممکن ہے۔"

یہاں پھر سے اس تفہیم پر سوال اٹھتا ہے کہ کیا علامہ محمد اقبال کی نظر میں نبوت کوئی ایسا روحانی درجہ ہے جسے کوئی بھی انسان خود بخود حاصل کر سکتا ہے؟ اگر علامہ محمد اقبال نے ایسا کہا ہے تو محمد سہیل عمر کا بیان درست تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن انھوں نے اس ضمن میں بہر حال ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ خطبات میں کسی بھی مقام پر ایسی کوئی رائے نہیں ملتی ہے۔ جب بات ہی نبوت کی ہو رہی ہے تو کیسے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک نبی تصورِ خدا سے منقطع یا محض سماجی مصلح ہے۔ یعنی اگر ایک نبی مصلح ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا سے ہے اور اسے وحی کا سہارا ہے البتہ اس کے بعد انھوں (12) نے خود ہی علامہ محمد اقبال کے بیانات کے پس منظری مطالعے کے حوالے سے وضاحت کی ہے:

"یہ دشواری اس لیے پیدا ہوئی کہ علامہ جن لوگوں سے خطاب کر رہے تھے ان کی ذہنی افتاد اور علمی پس منظر میں قریب ترین تشبیہ یہی نفسیاتی توجیہ ہو سکتی تھی جس سے انھیں نبوت کے بارے میں کچھ ذہنی اور عقلی تصور قائم کرنے میں مدد دی جاسکتی ۔ٹھیٹھ قرآنی اصطلاح میں دیکھتے تو یہ انداز مسائل پیدا کر سکتا ہے کیوں کہ قرآن کے مطابق نبی وہ بشر ہے جس پر خاص عنایت ربانی ہو اور اللہ کا پیغام فرشتے کے وسیلے (یا دیگر ذرائع) سے نوع انسان کی ہدایت کے لیے دیا جائے جس میں کائنات خدا اور انسان کے بارے میں بتایا جائے۔"

ڈاکٹر جاوید اقبال نے انبیا کو محض مصلح سمجھنے کے اعتراض کے جواب میں علامہ اقبال کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق انبیا چوں کہ ذاتِ باری تعالیٰ سے براہِ راست فیض یاب ہوتے ہیں اور انھیں وہ کلام عطا ہوتا ہے جو حیات بخش ہو، اس لیے وہ ایک قوم کی تعمیر کرتے ہیں۔ اُن (13) کے بقول:

"نبوت شعورِ ولایت کی وہ شکل ہے جس میں جذب کی کیفیت اپنی حدوں سے تجاوز کر کے ان قوتوں کو ڈھونڈے جو حیات اجتماعیہ کی صورت گر ہو سکتی ہوں اور یوں حیات کی جو نئی راہیں اس پر منکشف ہوئی ہیں ان کی روشنی میں وہ ایک نئی ہیئتِ اجتماعیہ وجود میں لاتا ہے۔"

ڈاکٹر جاوید اقبال اب سوال کرتے ہیں کہ یہاں کس بات سے ثابت ہوتا کہ نبی کا اللہ تعالیٰ سے تعلق منقطع ہوتا ہے اور وہ محض سوشل ریفارمسٹ رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی ڈاکٹر جاوید اقبال کا موقف درست اور منطقی معلوم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے وحی کو وصفِ حیات کے طور پر پیش کیا تھا اور اس حوالے سے انسانوں کے علاوہ دیگر اشیاء کی جانب

بھی اس کی نسبت کی تھی۔ اس حوالے سے یقیناان کے پیشِ نظر مکھی کی جانب وحی کیے جانے اور اللہ تعالیٰ کا پہاڑوں سے قرآنِ مجید سے متعلق خطاب رہاہو گا۔ محمد سہیل عمر کے مطابق اس طرح کا بیان اشکالات پیدا کرتا ہے اوروحی مابعد الطبیعیاتی نوعیت کی نہیں رہتی۔ اس ضمن میں خطبے کے تعارف میں اللہ تعالیٰ کی اپنی تخلیقات سے خطاب کے بارے میں جو کچھ قرآنِ مجید میں کہا گیاہے اس میں سے کئی حوالے پیش کیے جاچکے ہیں۔ عمر(14) کے نزدیک:

"اس عبارت سے پہلا اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم یہ لیا جاسکتا ہے کہ وحی فوق الطبیعی اور عالم غیب کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک کاملاً طبعی مظہر ہے۔"

قرآنِ مجید کا ادنیٰ طالب علم بھی یہ بات جانتاہے کہ اللہ تعالیٰ کا شہد کی مکھی سے خطاب ہو یا پہاڑوں سے، اس کا انبیا کی جانب ارسال کی گئی وحی سے کوئی تعلق نہیں، نہ ہی اس پر ایسے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً پہاڑوں سے خطاب کے سلسلے میں اگر کوئی اشکال پیدا بھی ہو تو کیا وہ منطقی ہو سکتا ہے اور ایک قاری یہ سوچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو نبوت عطا کرنا چاہتا تھا تاکہ پہاڑ اس کی تبلیغ کریں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد محمد سہیل عمر نے مدلل انداز میں وحی کی حقانیت اور اس کے محض انبیا کرام کی ذات سے تخصیص پر روشنی ڈالی ہے جس سے یہ بحث طول پکڑتی ہے اور اس کے نئے مفاہیم بھی واضح ہوتے ہیں۔ اسی سے انھوں(15) نے یہ بحث مسنوب کی ہے کہ علامہ محمد اقبال نے حضرت محمد ﷺ کے حوالے سے نبوت کی خاتمیت کا ذکر کرتے ہوئے استقرا کا ذکر کیا ہے اس سے ارتقا کا مفہوم کئی اشکالات بھی پیدا کر سکتا ہے:

"اگر اس خاتمیت کو عقل کے ارتقائی عمل کے ایک مفروضہ درجۂ کمال سے مشروط کر دیا جائے تو ایک علمی اشکال پیدا ہو جائے گا کہ اگر تاریخ انسانی میں پہلے کسی مرحلے پر کسی نقطۂ تاریخ پر عقل استقرائی کا کوئی مظہر مل جائے تو یہ مقدمہ منہدم ہو جائے گا اور اگر یہ بات مسلم رہے کہ اسلام سے قبل عقل استقرائی کا کوئی مظہر موجود نہ تھا تو یہ ما قبل اسلام کے انسان، (جن میں انبیا و اولیا و حکما) بھی شامل ہیں، سے ایک عیب منسوب کرنا ہو گا۔"

علامہ اقبال نے استقرائی حوالے سے انسانی عقل کے اس درجے کی بات کی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بہترین کلام کو سمجھنے اور اس پر رہتی دنیا تک عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس ضمن میں خطبے کے تعارف میں بات ہو چکی ہے۔ اس حصے کو خطبے کے اگلے اور پچھلے متن کے ساتھ ملا کر ہی کوئی معانی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اس متن سے ہٹ کر اسے دیکھنا، یقیناً اشکالات پیدا کرتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ کسی بھی تاریخی حوالے سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ گذشتہ اوقات میں انسان عقلی طور پر موجودہ انسانوں سے بہتر تھے یا ان کے لیے آخری وحی کا مطلب وہی تھا جو اس سے بہت قبل تھا۔ اس لیے عقلی طور پر ارتقا کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ گذشتہ تمام انبیا اور ان کی اقوام کی تحقیر مقصود ہے بلکہ

آپ ﷺ کو جدید اور قدیم دور کے سنگم پر کھڑا رہنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ گذشتہ سے آئندہ کو پیوستہ کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کی تائید تو خود قرآنِ مجید سے ہوتی ہے کہ یہ گذشتہ آسمانی کتابوں کی تائید کرتا ہے البتہ یہ ان سے زیادہ مستند ہے اور پہلے سے زیادہ فکری مواد مہیا کرتا ہے۔ اس کے بعد عمر(16) اسی ضمن میں علامہ محمد اقبال کے درج ذیل قول سے متعلق کہتے ہیں کہ اس کو مد نظر رکھا جائے تو نبی کریم ﷺ پر آنے والی وحی کو بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> Mystic experience, then, however unusual and abnormal, must now be regarded by a Muslim as a perfectly natural experience, open to critical scrutiny like other aspects of human experience. This is clear from the Prophet's own attitude towards Ibn Sayyad's psychic experiences.

لیکن اس اقتباس کو درست انداز میں سمجھنا ہو تو خطبہ اول کا دوبارہ سے مطالعہ کرنا ہو گا۔ جس میں علامہ محمد اقبال نے پروفیسر ولیم جیمز کی فکر سے درخت کی پہچان اس کی جڑ کے بجائے پھل سے کرنے کا کہا تھا۔ اس کے علاوہ پیشوائیت اور شہنشاہیت کے رد سے علامہ محمد اقبال نے جو یہ کہا کہ حضرت محمد ﷺ کے ذریعے وہ کلام اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو عطا کیا جس سے ان سب چیزوں یا باتوں کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے، محمد سہیل عمر کے مطابق یہ ختمِ نبوت کی دلیل نہیں ہیں۔ ان کا اعتراض درست ہو تا بشرطیکہ علامہ اقبال نے اسے ختمِ نبوت کی دلیل بنایا ہو۔ اس کے بعد قرآنِ مجید کی اختیار پسندی کے حوالے سے علامہ اقبال کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ علامہ اقبال کے سامعین کس نوعیت کے تھے اور انھوں نے کیوں کر اس انداز میں اسلام کی تفہیم کی کوشش کی۔ امام غزالی کے حوالے سے بھی محمد سہیل عمر کا موقف ہے کہ وہ کبھی بھی مذہبی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوئے جب کہ علامہ محمد اقبال نے خطبہ اول میں اس بات کو تفصیلاً بیان کیا ہے کہ کس طرح مسلمان یونانی فکر سے متاثر ہو کر اسلام کی اس تعلیم سے دور ہوئے جو انھیں گہرا علم اور بصیرت عطا کرتی تھی۔ اس کے نتیجے میں خشک فلسفیانہ ماحول میں اپنے روحانی مسائل کا حل نہ پاتے ہوئے وہاں سے روحانیت کی جانب واپسی ہوئی اور فلسفے کو بالکل ہی رد کر دیا گیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے محمد سہیل عمر کے امام غزالیؒ کے حوالے سے نظریۂ تشکیک کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ محض لفاظی تک ہی محدود رہے اور موضوعی حوالے سے جائزہ لینا یا دیگر پہلوؤں کی جانب دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ ان کی نظر میں تشکیک تصوف کی کوئی خامی نہیں بلکہ اس کا نقطہ آغاز ہے۔ ڈیکارٹ کا بھی کہنا ہے کہ میں شک اس لیے کرتا ہوں کہ میرا وجود ہے۔ یوں علامہ محمد اقبال کا یہ کہنا کہ یورپ میں جدید فلسفہ جس کا نہایت اہم جز تشکیک ہے،

اسلام ہی کی دین ہے، تو یہ غلط بھی نہیں۔ اسی طرح علامہ محمد اقبال کا یہ کہنا کہ یورپ کے جدید علوم کا نقطہ آغاز اسلام ہی کی دین تھا، بالکل درست ہے۔ اعوان (17) کے مطابق:

"حقیقت یہ ہے کہ مسلم حکما ہی نے اہلِ یورپ کو تجرباتی طریقِ تحقیق کی راہ دکھائی تاہم اہلِ یورپ نے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ بخل سے کام لیا۔"

محمد سہیل عمر نے اپنی ناقدانہ کاوش کا اختتام اسلامی ثقافت کے مغرب پر اثرات کے حوالے سے قولِ اقبال کو پیش کرتے ہوئے کیا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو محمد سہیل عمر کی یہ کاوش، بہت سے استفہامات سے مزین ہے۔ اس میں فکرِ اقبال کے تقریباً سبھی پہلوؤں پر سوال اٹھائے گئے ہیں اور عمومی طور پر یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ فکر اسلام سے ہم آہنگ نہیں ہے البتہ کہیں کہیں اس بات کا اقرار بھی موجود ہے کہ علامہ محمد اقبال کے مخاطبین جس طرز کے لوگ تھے یہ خطبہ ان کے حوالے سے درست ہے۔ اس کاوش کو پڑھنے والے قارئین کے دماغوں میں جنم لینے والے سوالات کے تسلی بخش جوابات ڈاکٹر محمد آصف اعوان کی "معارف خطباتِ اقبال" یا ڈاکٹر جاوید اقبال کی "خطباتِ اقبال تسہیل و تفہیم" میں مختصراً دیے گئے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی:

1.Iqbal, M. (2011). *The reconstruction of religious thought in Islam.* Lahore: Iqbal Academy Pakistan, p. 99

2. Ibid.

3۔ وحید عشرت، (2011ء)، تجدید فکریاتِ اسلام، طبع سوم، لاہور، اقبال اکادمی، ص ۱۵۴

4.Iqbal, M. (2011). *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, p.19.

5. Ibid. P-99

6۔ نیازی، سید نذیر، (2012ء)، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، لاہور: بزمِ اقبال، ص 193

7۔ عمر، محمد سہیل، (2002ء)، خطباتِ اقبال نئے تناظر میں، لاہور: اقبال اکادمی، ص: 115

8۔ ایضاً، ص: 116

9۔ اقبال، جاوید، (2016ء)، خطباتِ اقبال: تسہیل و تفہیم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص: 166

10۔ اعوان، محمد آصف، (2009ء)، معارف خطباتِ اقبال، لاہور: نشریات، ص: 167

11۔ عمر، محمد سہیل، (2002ء)، خطباتِ اقبال نئے تناظر میں، لاہور: اقبال اکادمی، ص: 116

12۔ ایضاً، ص: 117

13۔اقبال،جاوید،(2016ء)،خطباتِ اقبال: تسہیل و تفہیم،لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،ص:166

14۔عمر،محمد سہیل،(2002ء)،خطباتِ اقبال نئے تناظر میں،لاہور:اقبال اکادمی،ص:118

15۔ایضاً

16. Iqbal, M. (2011). *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore, Iqbal Academy Pakistan, p. 101.

17۔اعوان،محمد آصف،(2009ء)، معارف خطباتِ اقبال،لاہور:نشریات،ص۱۷۰